بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اسلام نے جس طرح اپنے نظام میں انسان کے فطری داعیات کا پورا پورا اہتمام کیا ہے اور کوئی چیز ایسی پیش نہیں کی جو اُس کی فطرت سے میل نہ کھاتی ہو بالکل اسی طرح اُس نے اپنی تعلیمات لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے استدلال کے قریب قریب وہی طریقے اختیار کیے ہیں جو عام فہم ہیں اور انسانی عقل و فکر سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اگر انسان کے دل و دماغ کو تعصبات اور ذاتی اغراض نے بالکل ماؤف نہ کر دیا ہو تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ کوئی شخص انہیں سنے اور دینِ حق کو قبول کرنے سے اعراض کرے۔

"عام فہم" کا لفظ سُن کر کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم الہامی طرزِ استدلال اور افہام و تفہیم کے عام طریقوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ مالک الملک جس احسن طریق سے اپنے بندوں کو سمجھا سکتا ہے کوئی دوسرا اُس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ ان الفاظ سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسانی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے استدلال کے وہی انداز اختیار کیے ہیں جن سے ہمارے دل و دماغ بالعموم آشنا ہیں اور پھر ان کے اندر اعجاز کی شان پیدا کی ہے۔ یہ چیز ایک انسان ہونے کی حیثیت سے ہمارے مناسبِ حال بھی ہے۔ اس ذاتِ بے ہمتا نے انسانوں کی ہی ایک زبان میں فصیح و بلیغ کلام نازل فرمایا جس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی اور جسے دیکھ کر فوراً یہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ الہامی کتاب کسی غیر انسانی زبان میں ہی نازل ہوتی تو نوعِ بشری کے لیے اس کے اعجاز کو جاننا محال ہوتا۔ اسی طرح اگر انبیا علیہم السلام نوعِ انسانی میں سے مبعوث نہ ہوتے اور ہماری رہنمائی کا فرض فرشتوں کو سونپ دیا جاتا تو ہم پر کبھی اتمامِ حجت نہ ہوتا۔ یہی وہ اصل وجہ ہے جس کی بنا پر انسانوں ہی میں سے بعض بزرگ و برتر ہستیوں کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تاکہ وہ لوگوں میں رہ کر معاشرتی

ذمہ داریوں سے لدکر، انسانی کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہو کر خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں اور انسانی فطرت کے محرم راز بن کر اُن کی اس طریق سے تہذیب کریں کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کی تیاری میں مصروف رہیں۔

اسلام نے اپنی تعلیمات لوگوں کے دلوں میں اتارنے کے لیے بھی یہی فطری اصول پیش نظر رکھا ہے اور غور و فکر اور بحث و استدلال کے انہیں مروجہ طریقوں سے کام لیا ہے جن سے نوع بشری فطری طور پر واقف چلی آرہی ہے۔ البتہ اُن کی ترتیب کا جو انداز اُس نے اختیار کیا ہے وہ فقید المثال ہے اور اس میں اعجاز کی پوری شان جھلکتی ہے۔

ان صفحات میں آج ہم قرآن مجید کے طرز استدلال پر ہی چند گزارشات پیش کریں گے۔

کسی اصول یا نظریہ کی صحت کے لیے لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لازماً کسی خارجی دلیل کا محتاج ہے۔ مگر دنیا میں بے شمار حقائق ایسے ہیں جن کو ہم فطری طور پر مانتے چلے جاتے ہیں اور ان کی صداقت کے بارے میں ہمیں کبھی شک و شبہ نہیں گزرتا۔ اُن کا اقرار ہماری فطرت میں داخل ہوتا ہے اور انہیں تسلیم کرنے کے لیے ہمارا وجدان ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ اگر ہم ان بدیہی حقائق کو تسلیم نہ کریں تو ہم اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرتے ہیں۔

وجودِ خالق کے اعتقاد کو بھی قرآن مجید انہی بدیہی حقائق میں سے ایک بڑی حقیقت سمجھتا ہے۔ یہ اعتقاد فطرتِ انسانی کا ایک لازمی جزو ہے اور دلائل و براہین کی ترتیب و تدوین سے قبل بھی انسان کے دل و دماغ میں راسخ ہو چکا تھا۔ ایک انگریز لڑکے، ایک اَن پڑھ مسلمان، ایک تعلیم یافتہ ہندو یا افریقہ کے کسی وحشی یا کسی عالم و فقیہ سے پوچھیے کہ خدا کیا ہے اور پھر اُن کے جوابات کو غور سے دیکھیے تو سب کی تہ میں ایک ہی بات نظر آئے گی یعنی کسی بلند و بالا ذات کا تصور جو اس کائنات کی علتِ اولیٰ ہے۔ مسٹر

میکڈانلڈ جو مدت تک افریقہ کی وحشی قوموں میں رہے ہیں اپنی کتاب "افریقین" میں لکھتے ہیں کہ اُن سب کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی شے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور اس کائنات کا منبع و مبدأ ہے۔ آخر انسان کے اندر وہ کونسا ایسا احساس تھا جس نے انسان کو مظاہرِ قدرت کے سامنے جھکا دیا، وہ کیا چیز تھی جس نے اس سے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کرایا، وہ کیا تھا جس نے اس کو تلاطم خیز دریاؤں یا سربفلک پہاڑوں کے سامنے سرِ نیاز خم کرنے پر مجبور کیا؟ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ ڈر ہے۔ ڈر تھا تو وہ بھاگ جاتے، چھپ جاتے لیکن اس کے بجائے انہوں نے ایک ایسی قوت کو مانا جو ازلی و ابدی ہے۔ موت سے ڈر تھا تو وہ مرنے سے ڈرتے لیکن انہیں روح کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ خالقِ کائنات کا احساس تو اُن بچوں تک میں پایا گیا جو الگ تھلگ رکھے گئے جنہیں کسی قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی اور نہ صرف بچوں میں بلکہ بہرے گونگوں نے بھی کسی خارجی امداد کے بغیر صرف اپنے وجدان کے مطالبے پر اس تصور کی تائید کی۔

انسان لاکھ سر مارے مگر وہ اُس ساعت کو کبھی متعین نہیں کر سکتا جب اس کے اندر وجودِ خالق کے احساس نے جنم لیا تھا۔ یہ سب شواہد اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ یہ اعتقاد کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے اور خود بخود ہمارے نفس میں فطرت نے ودیعت کر رکھا ہے۔ اس بنا پر یہ عقیدہ کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں بلکہ یہ نفس الامری حقیقت ہے جس کو انسان بغیر کسی ردوکد کے تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ گویا یہ تصور انسان کی گھٹی میں داخل ہے۔ جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو توڑ نہیں سکتا اسی طرح ایمان باللہ سبحانہ ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے۔ سو گردانی نہیں کی جا سکتی۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید اپنے بلیغانہ انداز میں یوں پیش کرتا ہے:

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (ابراہیم: ۱۰) — کیا آسمان و زمین پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمْ۔ — کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جو ہمارا اور تمہارا رب ہے؟

خدا کے وجود کا اعتراف چونکہ انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے اس لیے وحیِ الٰہی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ	اپنا رُخ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر۔ یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

قرآن مجید اسی بدیہی حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر روزِ ازل کے اُس عہد و پیمان سے تعبیر کرتا ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا۔ یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوتے ہے اور ہزار انکار کے باوجود انسانی فکر و عمل کے بےشمار گوشوں میں اس کے اثرات جھلکتے نظر آتے ہیں۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا (اعراف-۲۲)	اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی نسل کو نکالا تھا اور خود ان کے اُوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں، ہم گواہ ہیں۔

کلامِ الٰہی کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو اس طرزِ استدلال کے بےشمار نمونے ملیں گے۔ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں انسان کی اس فطری پکار کی طرف اشارہ نہ ملتا ہو۔ یہ دلیل سب سے قوی اور سب سے زیادہ مضبوط ہے کیونکہ یہ انسانی روح کا بنیادی تقاضا ہے۔

میں اپنی ہستی کے ثبوت کے لیے کسی منطقی دلیل کا محتاج نہیں۔ یہ ایسی معرفت طبعی ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔ آخر میری ہستی کا ثبوت میری معرفتِ طبعی سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر یہ معرفت میری عقلی اور اخلاقی فطرت کے لیے کافی نہیں تو پھر دنیا کا کوئی منطقی استدلال

اور کوئی دلیل کافی نہیں ہو سکتی۔

جب میں نے اس امر کو جان لیا کہ میں ہوں اور میں اپنی ہستی کا خود باعث نہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں کیسے یہاں آیا۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ میرے وجود کے پہلے اور اسباب تھے اور اُن سے پہلے اور، اور اُن سے پہلے اور۔ اگر وہ سبب ان کے بعد آیا جو میری تخلیق کا سبب نہیں تو میں بے سبب ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی ذات ایسی ہے جو ان اسباب کو ترتیب دیتی ہے۔ لہٰذا میری علتِ تخلیق کوئی اور ہے جو ان سب سے بالا ہے۔ یہ منطقی نتیجہ ہے اس بدیہی حقیقت کا کہ میں ہوں اور میں اس امر کو جانتا ہوں۔ جب میں موجود ہوں اور مجھے اپنے وجود کے بارے میں کوئی شک نہیں گزرتا تو پھر اپنے خالق و مالک کے وجود کے متعلق میں کیوں کسی شبہ میں گرفتار ہوتا ہوں۔ اُس ذات باری تعالیٰ کا وجود بھی اسی طرح کی ایک ٹھوس حقیقت ہے جس طرح کہ "میں" اور یہ ساری کائنات جس میں میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ جب مخلوق کا وجود بغیر کسی شک کے ہمیں تسلیم ہے تو خالق کے وجود کا بھی ایک بدیہی حقیقت کے طور پر ہمیں اعتراف کرنا چاہیے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن مجید نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ؕ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ (طور: ۳۶)	کیا کسی اور چیز نے انہیں جامۂ خلقت عطا کیا ہے یا وہی اپنے آپ کے خالق ہیں، یا اُن ہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں)، بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس فطری پکار کی طرف ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے بھی بحث کی ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب انسان خوشحال ہو، جب زندگی کے آلام و مصائب اُسے پریشان کر رہے ہوں تو اُس کی طبیعت میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کو اپنی قابلیت و استعداد پر محمول کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر انانیت کے جذبات بھی ابھرنے شروع ہوتے ہیں اور وہ اپنے مالک اور خالق سے ہر لحظہ دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے

کہ میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ یہ ساری کائنات میرے وجود کی محتاج ہے۔ سب میرے سامنے دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہیں اور مجھے کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی ضرورت نہیں میں بالکل غیر مسئول ہوں، کوئی مجھ سے باز پرس کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے انسانی فطرت مسخ ہونا شروع ہوتی ہے اور اُس کے اندر اپنے مالک کو پہچاننے کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہتی۔

انسانی فطرت درحقیقت اُس وقت نکھر کر سامنے آتی ہے جب کسی انسان کی جان پر آ بنے، جب شدائد و مصائب اُس پر ہر طرف سے ہجوم کریں اور وہ ان کی یلغار کے سامنے بالکل بے بس ہو، جب عقل اپنی ساری چابکدستیوں کے باوجود قطعاً بیکار ثابت ہو رہی ہو۔ اس موقع پر انسان اپنے سارے حجابات دُور کر کے اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ پھر اُس کی انانیت بھی سرنگوں ہوتی ہے اور وہ اس بات کے لیے مضطرب ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو مالکِ حقیقی کے حوالے کر دے جو زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہے اور جس کی طرف رجوع کرنے کے بعد انسان سارے دنیاوی سہاروں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللَّهِ تَدْعُونَ ۚ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ۔ (الانعام - ۴)

ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آجاتی ہے یا آخری گھڑی آپہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ بلکہ اُس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ انسان کی اس نفسیاتی کیفیت کو ایک دوسرے پیرایہ میں یوں بیان فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط

وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے

حَتّٰۤی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ۔

(یونس - ۲)

چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر باد موافق پر شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔

انسان کے دل میں یہ احساس کہ اس عالم مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظام کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام موجود ہے۔ ہمارے دل میں ایک ہلکی سی لے کی طرح ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اشپر اگر کسی کے ہاں اس سے زلزلہ و طوفان اٹھتے ہیں، کسی کے اندر اس سے قلندرانہ وجد و حال پیدا ہوتا ہے۔ کسی کے دل میں یہ اس خاموشی سے محو خواب ہوتا ہے کہ اسے اس کی گہرائی یا سطحیت کا شعور تک نہیں ہوتا۔ لیکن ہر صورت میں اس کی موجودگی ایک امر واقعہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خود اس

" دیکھے بھالے، بن سوجھے جانے پہچانے، بن بوجھے،

وجود کا احساس انسان کے نفس میں کیونکر ہوتا ہے۔ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری ہر شعوری کیفیت کے لیے ایک معروض کا وجود ضروری ہے۔ اگر غصہ آئے گا تو کسی بات یا شخص پر، اگر مسرت کی لہر دوڑے گی تو کسی چیز یا خیال سے، احترام کے جذبات موجزن ہونگے تو کسی شخص کے لیے۔ غرضکہ ہر نفسی کیفیت کے لیے ایک معروض ضرور ہونا چاہیے۔ یہ معروضات محسوس اشیا بھی ہو سکتی ہیں اور غیر محسوس اشیا بھی۔ دونوں سے یکساں طور پر شعوری کیفیت تحریک پا سکتی ہے۔ بسا اوقات مسرت کا خیال جس طرح ہمارے لیے تسکین کا باعث بنتا ہے خود مسرت نہیں بنتی۔ ایمانی کیفیت کا معروض

اسی طرح کی ایک اَن دیکھی حقیقت ہے جس کا احساس دل کی گہرائیوں میں ہر وقت موجود رہتا ہے مگر ہم اُسے حواس کی گرفت میں نہیں لاسکتے اور انسان کی حالت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے

دل من داند، و من دانم و داند دل من

اس اَن دیکھے وجود کے احساس کی مثالیں ہمیں زندگی میں ہر طرف ملتی ہیں۔ خود ان لوگوں میں بھی جو ایمانی کیفیت پیدا کرنے کی کوئی خاص مشق یا کوشش نہیں کرتے، یہ احساس موجود رہتا ہے کہ کوئی علیم و خبیر ذات ہمیں دیکھ رہی ہے، کوئی قادرِ مطلق ہستی ہمارا احاطہ کیے ہوئے ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات دل کی انجان گہرائیوں میں اُبھرنے والے معصیت آلود خیالات اس چشم ہمہ بیں کے احساس سے دب جاتے ہیں جب کہ دنیاوی گرفت و مواخذہ کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ چور متاعِ غیر پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کانپ اُٹھتا ہے اور اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی زبردست ہاتھ اُسے پکڑ کر اس فعل سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسی طرح جب انسان مصائب میں گرفتار ہو کر گھبرا اُٹھتا ہے اور ان کے چنگل سے نکلنے کی کوئی امید اسے نظر نہیں آتی تو وہ سہمے ہوئے بچے کی طرح لاشعوری طور پر اس آغوش کی طرف لپکتا ہے جو رحمت سے لبریز ہے اور جہاں سے کبھی کوئی شخص ناکام و نامراد واپس نہیں گیا۔

اس اَن دیکھی ہستی سے کوئی شخص جتنا زیادہ تعلق پیدا کرے اُسی نسبت سے اُس کے لیے یہ ذات دیکھی بھالی، سمجھی بوجھی حقیقتوں سے زیادہ حقیقی چیز بن جاتی ہے اور صفاتِ الٰہی رحیمی و کریمی، جباریت و قہاریت، عدل و احسان محض تصورات نہیں بلکہ محسوسات بن کر دنیا میں ہر طرف محیط نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ چیز بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن مجید نے صرف انسان کے اس وجدانی احساس کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس نے دلائل و براہین سے اس حقیقت کو ثابت بھی کیا ہے۔ اُس نے جہاں انسان کے اس جذبۂ فطرت کو ابھارا ہے کہ ایک ازلی و ابدی ذات اس کائنات کی خالق و مالک ہے اور اسی کی مشیت اور ارادہ سب پر حاوی ہے، وہاں اس نے اس امر کا بھی پورا پورا اہتمام

کیا ہے کہ یہ جذبہ خارجی اثرات سے دبنے نہ پائے اور اگر کبھی دب جائے تو غور و فکر کی قوت اسے مسلسل ابھارتی رہے اور اس طرح یہ زیرِ خاکستر آگ بھڑک کر انسان کے اندر ایمان کی حرارت اور یقین کا سوز پیدا کرے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انفس و آفاق میں ایسی نشانیاں رکھی ہیں جن سے ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود کی نہایت واضح شہادت فراہم ہوتی ہے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِيْرَهٗ۔ (۷۵-۱۰)

انسان خواہ (ہزار) بہانے بناتا پھرے مگر وہ اپنے لیے خود دلیل ہے۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱-۶)

ہم عنقریب اُن کو آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔ یہاں تک کہ اُن پر واضح ہو جائے کہ تحقیق حق یہی ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ذاریات-۱)

اور یقین کرنے والے کے لیے زمین میں اور خود تمہارے اپنے اندر نشانیاں ہیں، کیا تم نظر نہیں کرتے۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کے متعلق غور و فکر کے لیے ایک صحیح نقطۂ نظر کی نشاندہی بھی کر دی ہے:

اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ، ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (سجدہ ۱-)

وہی (ذات پاک ہے) جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل ذلیل نچڑے پانی سے بنائی۔ پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیئے تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

کائنات کے اس وسیع و پیچیدہ طلسم میں سب سے عجیب و غریب ہستی خود انسان ہے۔ مشتِ خاک سے اُس کی پیدائش کا آغاز، پھر ایک حقیر اور بے جان قطرۂ آب کے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اُس کے

جسم کا سڈول اور متناسب بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعتاً کہیں سے زندگی آجانا اور اس میں علم و حواس اور شعور و آگہی کی حیرت انگیز قوتیں اور صلاحیتیں پیدا ہوجانا سب خالق کے وجود کی زندہ شہادتیں ہیں۔

انسان کی ساخت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ وہ ناقابلِ احساس ذرات کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ کسی خالق و مالک کی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم تسلیم کرلیں کہ انسان کی پیدائش میں سوائے مادہ کے اور کسی ذات کا دخل نہیں تو پھر پہلے قدم پر ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادہ کی غیر معیّن توانائی کے بطن سے معیّن مظاہر کیسے پیدا ہوگئے۔ انسان کے جسم میں ایک حُسنِ ترتیب ہے جو کسی مرتب کے ذوقِ جمال کی آئینہ دار ہے۔ مادہ کے اندھے بہرے لزوم سے تو یہ چیز قطعی طور پر ناممکن ہے پھر انسانی جسم کے تمام اعضاء میں ایک تناسب کی موجودگی اور مختلف خدمات کے لیے اُن کی اہلیت و استعداد، اس حقیقت کی غمازی کر رہی ہیں کہ اس کائنات میں شروع ہی سے ایک قوتِ ناظمہ اور قوتِ رابطہ موجود ہے جس نے مادہ کے مختلف ذرات کو باہم جوڑ کر انہیں ایک انسان کی شکل عطا کی۔ اور پھر اس انسان کے قطرۂ آب سے اس کی نسل کو آگے بڑھانے کا انتظام کیا اور اس میں بھی تعجب انگیز بات یہ ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف سانچوں میں ڈھالا۔ اگرچہ اعضاء کے اعتبار سے سب انسان یکساں ہیں مگر ان اعضاء کے مابین تناسب کا رشتہ ہر انسان میں الگ الگ پایا جاتا ہے جو اُسے دوسرے ابنائے جنس سے ممیز کرتا ہے۔ فطرت کی یہ ساری رنگا رنگی کسی گہری تدبیر کی شہادت دیتی ہے۔ اگر "انسان سازی" کے اس وسیع و عریض کارخانے کو صرف مادہ کا عمل سمجھ لیا جائے تو پھر فکری دلیل حیران ہے کہ بے منصوبہ عمل سے متناسب صورتیں کس طرح پیدا ہوگئیں، وحدت کثرت میں کس طرح جلوہ گر ہوئی۔ یہ سوالات ایسے ہیں جن کی آپ طبیعیات یا کیمیا سے توجیہ نہیں کرسکتے۔ ان کی صحیح توجیہ اس اصول کو تسلیم کرنے سے ہی ممکن ہے کہ "انسان سازی" کے یہ سارے کرشمے کسی عزمِ حیات کے مظاہر ہیں۔

انسانی ساخت سے آگے بڑھیے تو معاملہ اور بھی پیچیدہ معلوم ہوتا ہے جس کی کوئی توضیح طبیعیات کے

اصولِ موضوعہ سے ممکن نہیں۔ عناصر میں ظہورِ ترتیب سے انسانی شکل تو بن سکتی ہے مگر اُس میں شعور و آگہی کا پیدا ہونا ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ انسان بار بار سوچتا ہے کہ آخر مادہ کی اندھی قوت نے شعور و ادراک کو کیسے جنم دیا۔ شعور بے شعوری کا غلاف چاک کر کے کیونکر ظاہر ہو گیا پھر خود یہ شعور اس توانائی سے کس قدر مختلف ہے جس سے وہ، کہا جاتا ہے، کہ پیدا ہوا ہے۔ یہ سب چیزیں بڑی ہی حیران کن ہیں اور سائنس ان کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکتی۔

بعض لوگ بڑی بیباکی سے یہ کہتے ہیں کہ ذہن و شعور مادہ کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے، لہٰذا وہ زندگی کے ارتقائی تغیرات کے لیے کسی بالاتر ذہن یا ذاتِ باری کی کارفرمائی کا یقین ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ اگر اس اصول کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان کائنات کے کارخانہ میں ایک عارضی اور اتفاقی شے ہے جو فطرت کی اندھی قوتوں کی تخلیق ہے۔ وہ فطرت کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا ہے جس سے وہ جس طرح چاہتی ہے کھیلتی رہتی ہے۔ اس میں کوئی عزم اور ارادہ نہیں، وہ مادہ کے تقاضات کا اُسی طرح پابند ہے جس طرح کہ جمادات۔ وہ بیشک اپنے آپ کو فطرت کے مقاصد کا نگہبان خیال کرتا رہے مگر یہ محض اس کی ابلہ فریبی ہے۔ حقیقت میں اُس کا علم اور اُس کے عزائم فطرت ہی کے آفریدہ ہیں اور اس لحاظ سے اس کا مقدر بھی مادہ کے بے حس ذرات کی کارفرمائی کا بالکل فطری نتیجہ ہے۔ جب ہم اپنی تخلیق کی علتِ اولیٰ مادہ کو قرار دیتے ہیں تو پھر ہمیں بلا تامل یہ مان لینا چاہیے کہ ہم فطرت کی کرشمہ سازیوں کے غیر متعلق تماشائی ہیں۔

آپ اگر مادیین کے سامنے انسان کو اس بے بس حیثیت سے پیش کریں تو وہ فوراً کانوں پر ہاتھ رکھ لیں گے اور کہیں گے کہ انسان کو مجبورِ محض تو خدا کا تصور بناتا ہے، ہم تو اس کو بالکل خود مختار سمجھتے ہیں، مگر یہ صرف فریبِ نظر ہے۔ اُن کے ہاں عجیب و غریب الجھن یہ پیش آتی ہے کہ وہ اپنے مقدمات کی بنیاد تو بلا تکلف مادہ پر استوار کرتے ہیں مگر ان بنیادوں پر استدلال کی جو دیواریں اٹھائی جاتی ہیں اور

اُن پر افکار و نظریات کے جو محل تعمیر ہوتے ہیں انہیں یہ حضرات اپنانے پر کبھی تیار نہیں ہوتے۔ ان کی کج فہمی اور ہٹ دھرمی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک طرف تو وہ انسانی شعور کو محض سالمات کی کرشمہ سازی سمجھتے ہیں مگر دوسری طرف اس نظریہ کو کہ انسان مجبور محض ہے، جو درحقیقت اُن کے اپنے مقدمات کا ہی نتیجہ ہے، کبھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور اس کے برعکس اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ شعور جس کی پیدائش صرف سالمات کے ہاتھوں سے ہوئی ہے وہ عالمِ طبیعی اور اس کی قوتوں پر اپنے تصورات عائد کرتا ہے جو قوانین کہلاتے ہیں اور پھر اُس کی مدد سے اُسی فطرت کو مسخر کرتا ہے جس کی وہ خود نہ صرف پیداوار ہے بلکہ جس کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی ہے اور اپنے فکر و عمل کو اسی کے اشارۂ ابرو سے معین کرنے پر مجبور رہے۔

یہ وہ مقام ہے جس پر قرآن حکیم ہمیں انسان کی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کو بے جان اور بے حس مادہ پیدا نہیں کرسکتا بلکہ یہ کسی مدبّر کی تدبیر کی رہینِ منت ہے۔ جس نے ایک خاص منصوبہ کے تحت اس کے مختلف اعضاء کے درمیان تناسب پیدا کیا اور انہیں اہلیت کے اعتبار سے مختلف فرائض سونپے۔ پھر اسی ذات نے کیلشیم، لوہے، کاربن کے اس پیکر میں زندگی پیدا کی اور اس طرح اُسے سرگرمِ عمل کیا۔ اس کے بعد اُس نے اُس کے اندر ذہن و شعور کی شمع جلائی تاکہ وہ خالقِ کائنات کی آیات کو بنظرِ امعان دیکھے۔ کانوں سے اس کے احکام کو توجہ و شوق سے سنے، دل سے انہیں ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر اپنے مالک کو پہچان کر اُس کا شکر بجالائے۔

آیئے اب ایک نظر اُن آیات پر بھی ڈال لیں جن میں انسان کو آفاق پر غور کرنے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ فطرت کے جمال میں ہی حسنِ ازل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی پکار پکار کر انسان کو ایک خالق کے وجود کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ سورج کی خشمگیں کرنوں میں نسیمِ سحر

کے جھونکوں میں، چاند کی ٹھنڈک ہیں، صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں اسے آیاتِ الٰہی نظر آتی ہیں۔ وہ یہ باور ہی نہیں کر سکتا کہ یہ ساری کائنات جو اتنی منظم ہے، جس کے رنگارنگ مظاہر میں ایک نہایت گہرا رشتہ موجود ہے، بغیر کسی خالق اکبر کے پیدا ہو گئی ہے۔ یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں کروڑوں جاندار اور بے جان اشیا، یہ علل و اسباب کا غیر منقطع تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا حیرت انگیز نظام قدم قدم پر اپنی کرشمہ زائیوں سے انسان کے دامنِ دل کو کھینچتا ہے اور انسان بالکل بے اختیار ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

مناظرِ فطرت کی ان روشن آیات کے متعلق یہ احساس ہر زمانے کے ادب میں نہایت عمدہ جواہر پاروں میں ملتا ہے۔ سعدی اس احساس کی ترجمانی میں یوں نغمہ سرا ہوا ہے:-

برگِ درختاں سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

ربو (RIBOT) نے اپنی کتاب "نفسیات جذبات" میں افریقہ کے ایک وحشی کے مذہبی خیالات نقل کیے ہیں۔ آپ ان احساسات کو ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ یہ فطرت سے کس قدر قریب ہیں:

"بارہ برس کا ذکر ہے کہ میں اپنا گلہ چرانے کے لیے گیا، دھند لکا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ میں ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور اپنے دل سے غم انگیز سوالات پوچھنے لگا۔ غم انگیز اس وجہ سے کہ میں ان کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ ستاروں کو کس نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے؟ آسمان کس ستون پر قائم ہے، دریا کے پانی کو دیکھو کہ کبھی نہیں تھمتا ہے ہی چلا جاتا ہے صبح سے شام اور شام سے صبح تک بس اس کا یہی کام ہے؟ آخر یہ کہاں جا کر رکتا ہے اور اسے کون بہا رہا ہے۔ بادلوں ہی کو دیکھو کہ آتے جاتے رہتے ہیں، کبھی کبھی پانی برسا جاتے ہیں۔ آخر وہ کہاں سے آتے ہیں۔ انہیں کون بھیجتا ہے؟ ہمارے بجاری تو پانی برسا نہیں سکتے اس لیے کہ میں نے کبھی انہیں آسمان پر جاتے ہوئے نہیں دیکھا، پھر آخر کون برساتا ہے۔ میں ہوا

کو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن آخر وہ کیا چیز ہے، اُسے کون چلاتا ہے؟ ان سوالات کا جواب دل سے نہ پاکر میں نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔"

اسرارِ کائنات کے متعلق عقل و خرد کی یہ بے چینی جو آگے چل کر عقیدے اور ایمان پر منتج ہوتی ہے صرف افریقہ کے اس وحشی ہی تک محدود نہیں بلکہ یہ انسان کی ایک فطری خلش ہے جسے دُور کرنے کے لیے ہر آدمی مضطرب اور پریشان رہتا ہے۔ ہمارے ملک کا مایۂ ناز شاعر جسے زندگی میں غمِ دوراں سے کم ہی فرصت نصیب ہوئی، وہ بھی فرطِ حیرت سے پوچھتا ہے:

لالہ و گل کہاں سے آتے ہیں؟

ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

یہ خیال فکر و احساس رکھنے والے انسان کا ایک بالکل فطری سوال ہے اور اس سوال ہی کی بدولت انسان کو حقیقت کی طرف صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اُسے اگر اس کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا تو وہ "لاادری" کہہ کر چپ ہو جاتا ہے جو خود اثبات واجب الوجود کی ایک سلبی شکل ہی ہے

سمجھا ہے پرے تجھ کو اِدراک کی سرحد سے

جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

اسی نوعیت کا ایک تاثر صاحبِ ہدایہ نے اپنی کتاب "تعلیم المتعلم" میں قلمبند فرمایا ہے۔ علامہ رحمہ اللہ تعلیم و تدریس کے فطری اصولوں پر گفتگو کرتے ہوئے ایک فلسفی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ منطقی طرزِ استدلال کے ذریعہ وجودِ باری تعالیٰ کا کھوج لگانے سے جب اکتا گیا تو آشفتہ سر ہو کر صحرا کی جانب نکل گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدا کو آخر حکما اور فلاسفہ ہی تو نہیں مانتے اس کی ذات پر وہ لوگ بھی ایمان رکھتے ہیں جنہیں زندگی میں کبھی بھی رسمی تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر نہیں آتا۔ ایسے افراد اس ذات کے وجود کے لیے کیا دلائل پیش کرتے ہونگے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنی دیر میں اُس کے پاس سے ایک گڈریا گزرا فلسفی نے اُسے روک لیا اور پوچھا "کیا تم خدا کو مانتے ہو؟" گڈریے نے جواب دیا "بے شک"

فلسفی نے دریافت کیا: اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ اس پر گڈریے نے اپنی بدویانہ زبان میں یہ کہا:

اَلْبَعْرُ یَدُلُّ عَلَی الْبَعِیْرِ وَالْاَثَرُ یَدُلُّ عَلَی الْمَسِیْرِ فَالْاَرْضُ ذَاتُ فِجَاجٍ وَالسَّمَآءُ ذَاتُ بُرُوْجٍ اَفَلَا تَدُلُّ عَلَی الْعَلِیِّ الْقَدِیْرِ؟

اونٹ کی مینگنیاں ہوں تو پتہ چل جاتا ہے کہ اونٹ گزرا ہے نقوشِ پا راہ نورد کا پتہ دیتے ہیں۔ تو اب کیا یہ کشادہ راستوں والی زمین اور یہ برجوں والا آسمان ایک برتر وقادر ذات کی شہادت نہیں دیتے؟

گڈریے کے ان الفاظ میں ہر شخص خالقِ کائنات کے بارے میں انسان کے فطری سوال کا فطری جواب دیکھ سکتا ہے۔ ان میں ایک ایسی حکمت اور دانائی موجود ہے جس پر ہر سلیم الفطرت انسان کا دل خود گواہی دیتا ہے۔

قرآن مجید اسی طرزِ استدلال سے انسان کو حقیقت تک پہنچاتا ہے وہ اسے بار بار اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ اس کائنات میں پھیلی ہوئی آیاتِ الٰہی پر غور کرے تاکہ وہ ایک صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوشمندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی ساخت پر غور و فکر کرتے ہیں۔

یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالقِ کل کا پتہ دیتا ہے اور انہیں دیکھ کر ہر شخص بآسانی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ خدا سے غافل نہ ہو اور آثارِ کائنات کو جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ غور و فکر کے ساتھ مشاہدہ کرے۔ (باقی ص۹۲ پر)

(بقیہ اشارات)

وَمِنْ اٰیٰتِہِ الَّیْلُ وَالنَّھَارُ وَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۔ (۴۱-۵)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔

یہ دن اور رات کا الٹ پھیر، یہ سورج اور چاند کی روشنی، اور ایک مقررہ رفتار کے ساتھ لگے بندھے پروگرام کے تحت اُن کا طلوع و غروب اس بات کی دلیل ہے کہ اس ابلقِ ایام کے دوش پہ کوئی سوار ہے جو اس کے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۲-۲۰)

جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں بے شمار نشانیاں ہیں۔

ان آیات میں نماتِی کائنات کی جن نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے انسانی زندگی سے ان کا نہایت گہرا تعلق ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق ایک صانع کے وجود کی شہادت دیتی ہے۔ گردشِ لیل و نہار، لاکھوں من وزنی جہازوں کا پھولوں کی طرح سطحِ آب پر تیرنا، مینہ کا برسنا اور اُس سے زمین کا سیراب ہونا اور پھر اس سے انواع و اقسام کی زندگی کا نمودار ہونا، سب اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ کوئی قوتِ ناظمہ کائنات کے اس وسیع کارخانے کو بڑی حکمت اور دانائی سے چلا رہی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ - وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا -

وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں۔ پھر وہ اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لیے چل رہی ہے اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے۔ اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بیشمار دوسری نشانیوں میں ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ اُس نے غیر محسوس اور غیر مرئی سہاروں پر فلک کو قائم کر رکھا ہے۔ اس فضائے بسیط میں اگرچہ بظاہر کوئی چیز نظر نہیں آتی جو ان بے حد و حساب اجرامِ فلکی کو تھامے ہوئے ہو لیکن اگر ذرا چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خالقِ کائنات کی اَن دیکھی طاقت انہیں اپنے اپنے مقام و مدار پر روکے ہوئے ہے اور ساں سے اپنے ضابطے کی پابندی کرا رہی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے۔

قرآن مجید میں اس موضوع پر اس کثرت کے ساتھ آیات موجود ہیں کہ ان سب کا یہاں احاطہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ کلام پاک کی شاید ہی کوئی آیت ایسی ہو جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ انسان کو بار بار اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ مناظرِ فطرت، خوشبوئیں، روشنی اور اندھیرے کا سنجوگ، سطحِ سمندر پر کشتیوں کا چلنا، آسمانوں کا غیر مرئی سہاروں پر کھڑا ہونا سب ایک خالق اور مالک کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو پکار کر کہتا ہے،

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ

کیا وہ دیکھتے نہیں کہ اونٹ کیسے بنائے گئے ہیں،